سلسلہ اشاعت امامیہ مشن پاکستان (رجسٹرڈ) نمبر ۷

آثارِ قدرت

از قلم

سرکار سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی مجتہد العصر لکھنؤ دام ظلہ

قیمت ۳ ؍

امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ داؤد بازار لاہور

کی

یہ ساتویں پیش کش ہے جو امامیہ مشن لکھنؤ کے رسالہ نمبر ۶۲ بنام "خدا کی معرفت" کا ایک حصہ ہے جس کو سرکار سید العلماء نے اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے الگ کر دیا ہے۔ اس سے قبل:۔ (۱) خدا کا ثبوت (۲) حسین اور اسلام (۳) شجاعت کے مثالی کارنامے (۴) قاتلان حسین کا مذہب (۵) محاربہ کربلا (۶) اسیری اہل حرم وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔

کائنات پر مجموعی نظر ڈالنے سے اس کے موجد، مرکز اور خالق کو عقل تلاش کرتی ہے یہی خدا آگاہی کی طرف پہلا قدم ہے۔ جناب امیر علیہ السلام فرماتے ہیں "دین کی پہلی منزل خدا کی معرفت ہے"۔

اگر دین کو بلا معرفت خدا مان بھی لیا تو وہ ایک کھوکھلی عمارت ہے۔ لہذا نسل انسان کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس کو اس کے خالق و معبود کی معرفت کی راہ پر لگا دیا جائے۔ یہی زیر نظر رسالہ کا مقصد ہے۔

امید ہے کہ ہمدردان مذہب و ملت اس کی توسیع اشاعت ہی سعی بلیغ فرمائیں گے۔ جس سے خدا و رسول خوش ہوں گے اور کارکنان امامیہ مشن پاکستان کی حوصلہ افزائی ہو گی۔

اگر ہر انجمن اپنی استطاعت کے مطابق لٹریچر کی مفت تقسیم کا انتظام رکھے تو اشاعت مذہب کے مستبعد نتائج پیدا ہونا یقینی ہیں۔

خادم دین سید حسن علی شاہ کاظمی المشہدی سکرٹری امامیہ مشن پاکستان لاہور محرم ۱۳۷۵ھ

(انصاف پریس لاہور)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝
وللہ الحمد والصلوٰۃ علی رسولہ وآلہ

جبکہ خدا کے اقرار اور انکار کا دار و مدار اس ایک امر پر ہے کہ کائنات کی تخلیق میں شعور و اختیار کارفرما ہے یا نہیں تو ہمیں ایک ایسا معیار پیش کرنے کی ضرورت ہے جس سے اس بحث کا تصفیہ ہو سکے۔ اور پھر اسی معیار پر کائنات کے نظم و نسق کی جانچ کی جا سکے۔

ارادی اور غیر ارادی اشیاء کا تفرقہ

(۱) ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے سامنے بعض چیزیں بغیر ارادہ و اختیار کے ہوتی ہیں اور بعض ارادہ و اختیار کے ساتھ۔ مرتعش کا ہاتھ تھرتھراتا ہے بغیر ارادہ و اختیار کے اور کاتب کے قلم کو حرکت ہے ارادہ کے ساتھ ہذیان بکنے والے کی

۱؎ اس بحث کو سب سے پہلے تشریح کے ساتھ عربی میں علامہ شیخ محمد جواد بلاغی اعلی اللہ مقامہ نے اپنی کتاب "البلاغ المبین" میں درج کیا ہے۔

زبان کی گردش سے بھی الفاظ پیدا ہوتے ہیں اور زبان رکتی، ٹھہرتی، گھٹتی، بڑھتی ہوئی حروف کی تشکیل کرتی ہے مگر اُسے امر اضطراری کہا جاتا ہے، اور ایک خطیب بھی جب تقریر کرتا ہے تو اُس کی زبان بھی الفاظ اور حروف کو پیدا کرتی ہے اسے سمجھا جاتا ہے فعل اختیاری۔

ایک آدمی کا کوٹھے پر سے پاؤں پھسلتا ہے۔ زمین پر گر پڑتا ہے اور ایک آدمی کوٹھے پر سے پھاند پڑتا ہے۔ ذریعہ ایک ہے اور نتیجہ بھی ایک ہے۔ وہ بھی اوپر سے نیچے آیا اور یہی فضا اُس نے بھی طے کی۔ مگر اس کو اضطراری کہتے ہیں، اس کو اختیاری۔ ایک دیوانہ بھی حالت جنون میں کچھ نہ کچھ کہتا ہے۔ کوئی اس کی طرف اعتنا نہیں کرتا۔ اور ایک دانشمند انسان کلام کرتا ہے ہر شخص سننے لگتا ہے، اور توجہ کرتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ پہلا کلام الادہ شعور کا نتیجہ نہیں ہے۔ اور دوسرا شعور و ارادہ کے ماتحت ہے۔

آپ دنیا کی سیر کیجیے۔ اطراف زمین میں سیاحت فرمائیے۔ آپ کے سامنے مختلف طرح کے نقشے پیش ہوں گے۔ جن میں آسانی سے آپ یہ تمیز کریں گے کہ کون ان میں سے خود بخود موجود ہو گئے ہیں اور کون کسی باہوش ہستی کی کارگزاری کا نتیجہ؟

آپ کو معلوم ہے کہ ریگستان میں ہوا جو چلتی ہے وہ اپنے ساتھ ذرات ریگ کو لاتی ہے۔ اُن ہی سے بڑے بڑے ٹیلے ریت کے ہو جاتے ہیں اور

اُس کی وجہ سے کہیں نشیب ہو جاتا ہے کہیں فراز، کہیں پستی اور کہیں بلندی۔
آپ ان مناظر کو دیکھ کر کبھی یہ تجویز نہیں کرتے کہ کوئی اس میدان میں آیا
تھا اور اُس نے خاص طور سے کہیں پر اونچا کیا ہے اور کہیں پر نیچا بلکہ اس
کو دیکھ کر ہی سمجھ لیتے ہیں کہ ہوا کی وجہ سے اونچا نیچا ہو گیا ہے۔ مگر جنگل ہی
میں جب کارواں سرا ملتی ہے جس میں آپ قیام کرتے اور آرام لیتے ہیں
تو دل دعا دینے لگتا ہے کہ خدا بھلا کرے اُس کا جس نے یہاں اس
مکان کی تعمیر کر دی۔ اسے آپ نے یہ طے نہیں کیا کہ شاید ہوا کی حرکت سے اور
ذرّات کے اجتماع سے یہ مکان تیار ہو گیا ہو۔

دنیا جانتی ہے کہ زمین میں قوت انتجار ہے یعنی پتھر کی شکل میں ذرّے
مٹی کے تبدیل ہو جاتے ہیں اور آفتاب کی شعاعیں زمین کی خاصیت کے لحاظ
سے ان اجزا کو مختلف صورتوں میں رنگ دیتی ہیں۔ ان ہی سے مختلف
پتھر پیدا ہوتے ہیں۔ عقیق۔ زمرّد، یاقوت اور دھاتیں پیدا ہوتی ہیں۔
سونا، چاندی، لوہا۔ تمام معدنیات کی یہی نوعیت ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ پتھر جو
زمین میں پیدا ہوں گے کچھ نہ کچھ اُن کی ہندسی شکلیں بھی ہوں گی۔ کیونکہ
شکل و مقدار ہر جسم کے لئے ضروری ہے۔ کوئی مثلث ہو گا اور کوئی مربع۔
کوئی مدور ہو گا اور کوئی مکعب۔ مگر ان کو دیکھ کر آپ یہ فیصلہ نہیں کرتے کہ کسی
نے ان پتھروں کو اس طرح سے تراش کر ان پہاڑوں میں دفن کر دیا ہے۔ آپ

اس کو زمین کی قوت طبعی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن اسی زمین میں جب مختلف ظروف اور اس طرح کی چیزیں دکھلائی دیں جو خاص ضروریات سے متعلق ہیں جیسے کفگیر، چمچے، دیگ، پتیلیاں وغیرہ تو انہیں عقلائے عالم نے زمین کی پیداوار قرار نہیں دیا بلکہ یہ رائے قائم کی کہ ایک زمانہ ایسا تھا جب انسان اپنے ضروریات پتھروں سے پورا کرتا تھا۔ اس کی وجہ سے ایک تاریخی دور کا انکشاف ہو گیا جس کا نام رکھا گیا "عصر حجری" یعنی پتھر والا زمانہ۔ یہ کس لئے؟ آخر یہ کیوں نہ سمجھا گیا کہ جس طرح زمین میں بہت سے پتھر مختلف شکلوں کے پیدا ہوتے ہیں۔ اُسی طرح یہ چیزیں زمین میں طبعی قوت سے پیدا ہو گئی ہیں اور کسی شخص خاص کی کارگزاری کا نتیجہ نہیں ہیں۔

عہد قدیم میں تاریخ تو لکھی جاتی نہ تھی۔ اس زمانہ کی تاریخیں اب انہی "حجریات" اور آثار قدیمہ کے ذریعہ سے مرتب کی جا رہی ہیں۔ اس کے لئے مہمیں مقرر کی جاتی ہیں اور بڑے بڑے علمائے طبیعات، علمائے السنہ اور انجینئر جاتے ہیں۔ کھنڈروں کو، بڑے بڑے ٹیلوں کو اور زمین کے مختلف حصوں کو کھود کر ایسی چیزیں برآمد کی جاتی ہیں جن سے سابقہ حالات کا پتہ چلے۔ وہاں کوئی بتانے والا بیٹھا نہیں ہے مگر یہی خاموش آثار ہیں جن کے ذریعہ سے ہم پتہ لگاتے ہیں کہ اس زمانہ کے حالات یہ تھے۔

پھر کیا وجہ ہے کہ کہیں پر تو آپ جلدی سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ ارادہ و اختیار کا نتیجہ ہے اور کہیں کہتے ہیں کہ بغیر ارادہ و اختیار خود بخود ہے یہ آخر معیار

کون سا ہے؟ یہ کیا بات ہے کہ دیوانہ آپ کے سامنے باتیں کرتا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ اس کا دماغ خراب ہے اور ایک فاضل مقرر تقریر کرتا ہے۔ آپ یہ شبہہ نہیں کرتے کہ اس کا دماغ بھی خراب ہے اور اس دیوانگی کی رو میں یہ تقریر کر رہا ہے۔ اگر آپ کہیں کہ مجنون کی تقریر کو مجنونانہ سمجھنا پہلے اُس کے جنون کا علم ہونے کی وجہ سے ہے اور مقرر کی تقریر کو نتیجۂ عقل و فہم سمجھنا اس حسنِ ظن کی بناء پر ہے جو ہر انسان کے ساتھ ہونا چاہیے جب تک کافی ثبوت نہ ہو کسی کے متعلق انسان کو یہ رائے قائم کرنے کا حق نہیں کہ اس کا دماغ خراب ہے۔

میں کہوں گا کہ اوّل تو یہ حسنِ ظن ہے اور حسنِ ظن سے کبھی یقینی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا حالانکہ ہم اپنے وجدان کے لحاظ سے اُن صورتوں میں جب ہمارے سامنے کوئی فاضلانہ تقریر، عالمانہ تصنیف ہو یقین کا احساس رکھتے ہیں اس امر کے متعلق کہ یہ ایک وسیع علم و ادراک کا نتیجہ ہے آپ ہی اپنے دل کی گہرائیوں میں اندازہ لگائیے کہ کسی اعلیٰ درجہ کے کاتب کی تحریر اور نقاش کے نقش یا بڑے قابل و لائق شخص کی تصنیف کو دیکھ کر جو اس کی تعریف کرتے ہیں تو کیا وہ صرف حسنِ ظن کی بنیاد پر ہے یعنی دل میں یہ شبہہ موجود ہے کہ شاید اس کا دماغ خراب ہو اور جنون کے عالم میں یہ تحریر، نقش اور تصنیف عالمِ وجود میں آگئی ہو؛ ہرگز نہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا

کہ آپ کو یقین ہے کہ اس کا لکھنے والا بالکل صحیح الدماغ ہے اور اس نے قدرت و اختیار کے ساتھ اس کو لکھا ہے۔ اس امر کا اس درجہ یقین ہوگا کہ آپ اس خیال کو کہ وہ غیر ارادی طور پر وجود میں آیا ہے خود دیوانگی کا نتیجہ قرار دیں گے اور کہیں گے کہ یہ ہرگز عقل میں آنے کی بات نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف حسن ظن کا نتیجہ نہیں ہے۔

دوسرے یہ آپ کا بتایا ہوا معیار شکستہ ہو جاتا ہے اس طرح کہ وہی شخص جس کی تقریر و تحریر کی آپ تعریف کر رہے تھے خدانخواستہ دیوانہ ہو جائے، اُس کا دماغ خراب ہو جائے، بہکی بہکی باتیں کرنے لگے تو آپ فوراً حکم لگا دیں گے کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا اب آپ حسنِ ظن سے کام نہیں لیتے اور نہ ہی مجنون جس کے متعلق سابق سے معلوم ہے کہ اس کا دماغ خراب ہے اگر اچھا ہو جائے۔ ٹھیک طور پر باتیں کرنے لگے تو آپ خود سمجھ لیں گے کہ وہ صحیح ہو گیا، اس کا عارضہ دور ہو گیا یہ آپ کیونکر اندازہ کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس کا سبب کچھ اور ہے اور کوئی ایسا معیار موجود ہے جس کی بناء پر خود افعال بتلاتے ہیں کہ ان کا کرنے والا صاحب شعور و اختیار ہے یا نہیں۔

پھر اُس آخری مثال میں جو میں نے آپ کے سامنے پیش کی۔ وہ زمین سے نکلے ہوئے ظروف اور مختلف طرح کے آلات و اسباب ان میں تو کوئی

شخص سامنے ہے ہی نہیں جس کی نسبت حسنِ ظن سے کام لیا جائے۔ یہاں صرف ایک بے زبان صنعت ہے جو بتلاتی ہے کہ اُس کا کوئی صانع ہے اور وہ صاحب ارادہ و اختیار ہے

معلوم ہوا کہ یہ جو بتایا گیا ہے درست نہیں ہے۔ پھر کیا معیار ہے؟ اچھا مجھ سے سنئے اور اگر اس کے علاوہ کوئی بات ٹھیک نہ اُترے تو تسلیم کیجئے کہ یہی معیار درست ہے۔

وہ یہ ہے کہ جب کوئی بات اغراض و مقاصد کے موافق منظّم و مرتّب صورت سے ہو گی اور ایک خاص نظام اور توازن رکھتی ہو گی تو وہ شعور و اختیار کا نتیجہ قرار پائے گی۔ اور جب مقصد و غرض کے لحاظ سے اُس میں کوئی منظم و ترتیب نہ ثابت ہو تو وہ شعور و اختیار کی طرف منسوب نہ ہو گی۔

اسی معیار سے آپ ایک مجنون کے جنون و صحت کی حالت کا موازنہ کرتے ہیں۔ جب تک اس کے الفاظ نامربوط اُس کا کلام بے تسلسل ہے آپ سمجھتے ہیں کہ وہ جنون کا نتیجہ ہے۔ اور جس وقت سے اُس کے افعال و اعمال میں انتظام و ارتباط پیدا ہو اور وہ اغراض و مقاصد کے ماتحت ہو گئے اُسی وقت سے آپ اُسے صاحب عقل سمجھنے لگے۔ جتنی ہی یہ بات زیادہ ہوتی ہے اُتنی عقل و شعور پر زیادہ روشنی ڈالتی ہے۔ یہی وہ معیار

ہے جو صرف شعور و عدم شعور ہی کو نہیں بلکہ شعور و اختیار کے مختلف مراتب کا بھی پتہ دیتا ہے اور اس کی مقدار کا تعین کرتا ہے۔ اگر کوئی دیوانہ علاج کے بعد اس درجہ پر آگیا کہ پانچ باتیں ٹھیک کہتا ہے اور چار باتیں بہک کر غلط کہہ دیتا ہے تو آپ سمجھتے ہیں کہ ابھی اس کا مرض پورے طور پر زائل نہیں ہوا یہ صحت کے قریب آگیا ہے اور اگر سب باتیں بالکل ٹھیک کرنے لگا تو آپ سمجھتے ہیں کہ اب بالکل اس کی عقل صحیح ہو گئی۔

اسی معیار کی بنا پر آپ ریگ کے تودوں کو ارادہ و اختیار کا نتیجہ نہیں قرار دیتے کیونکہ وہ کسی خاص مقصد و غرض کے ماتحت نظر نہیں آتے لیکن جنگل میں تعمیر شدہ مکان یا سرائے کو آپ کسی شخص کی کارگذاری کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔

اسی بنا پر زمین کے پیدا ہونے والے معدنیات کو باوجود شکل و مقدار رکھنے کے آپ کسی خاص شخص کی طرف منسوب نہیں کرتے کیونکہ وہ شکلیں کسی خاص تناسب سے نہیں پائی جاتیں لیکن زمین سے نکلے ہوئے برتنوں کو انسانی کارگذاری سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ انسانی ضروریات و اغراض سے متعلق ہیں۔

معلوم ہوا کہ ضروریات کے لحاظ سے تناسب، نظم اور ارتباط یہی وہ چیز ہے جو موجد کا پتہ دیتی ہے۔ اور اُس کے شعور و اختیار کی دلیل ہوتی ہے۔ حالانکہ آپ نے ان مثالوں میں موجد کو دیکھا نہیں تھا۔ بس یہی تھا کہ نقش

کو دیکھ کر نقاش کا پتہ لگا لیا۔ صانع کو دیکھ کر مصنوع کی طرف ذہن کا انتقال ہوا۔

موجد کی تلاش

دنیا کی ہر صنعت کو دیکھ کر ذہن انسانی میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا موجد کون ہے؟

سائنس کی بہت سی صناعیاں جو ہماری نظر کے سامنے آتی ہیں۔ ان میں واقعی حیرت ناک چیزیں پائی جاتی ہیں جن کے اسرار سے دیکھنے والے عموماً واقف نہیں ہوتے۔ ریل، موٹر، جہاز اور ہوائی جہاز ہر ایک ایسی ایجاد ہے جس کے موجد کی تعریف کرتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ آپ جرمنی یا امریکہ کے کسی کارخانہ میں جائیں اور لوہے کی مشینیں نظر آئیں۔ جو کوئلہ اور پانی کی امداد سے چلتی ہیں۔ ان مشینوں کو دیکھ کر انسان واقعی ششدر رہ جاتا ہے۔ مشین کے پرزے تیزی کے ساتھ چلتے ہیں۔ ایک عالم ہے جو حرکت میں ہے سب کہیں گے کہ بنانے والے نے خوب مشین بنائی ہے۔ اب اگر کوئی کہے اور قسمیں کھا کھا کر کہے کہ کسی انسان کی کارگزاری کو اس میں دخل نہیں۔ لوہے کے ٹکڑے خود آئے، مجتمع ہوئے اور ایک خاص شکل میں مرتب ہو گئے۔ کوئلہ

اپنے معدن کی تہ سے نکلا۔ یہاں پہنچا اور مشین کے اندر چلا گیا۔ پانی سمندر سے کھنچ کر آیا اور اس میں بھر گیا۔ پھر آگ خود ہی دہکی۔ دھواں بلند ہوا۔ اور مشین متحرک ہو گئی۔ وہ کہے اور بہت زور دے کر سمجھانا چاہے مگر سننے والا اس کا کبھی یقین نہ کرے گا۔

یہ کیوں؟ اس بناء پر کہ ان میں اغراض و مقاصد مضمر ہیں اور ان ہی کے لحاظ سے ان میں توازن و تناسب قائم ہے اگر یہ مشینیں اس طرح کی ہوتیں کہ ان کے اجزاء بے ترتیب ہوتے نہ کوئی ربط ہوتا اور نہ کوئی مناسبت تو تسلیم کر لیا جاتا کہ یہ اجزاء خود ہی مجتمع ہو گئے ہیں مگر چونکہ ان میں اغراض و مقاصد کے لحاظ سے ترتیب قائم ہے اور مخصوص فوائد مضمر نظر آتے ہیں اس لئے سمجھتے ہیں کہ ان کا کوئی موجد تھا جو مناسبتوں سے واقف تھا اور صناعی پر قدرت رکھتا تھا۔ اسی نے اُن کو ایجاد کیا ہے۔

پھر جب ہر چیز میں یہ اصول قائم ہے تو اس مجموعۂ عالم کائنات میں اس اصول سے انحراف کیونکر ہو سکتا ہے۔ آپ اس عالم پر غور کیجئے۔ اگر اس میں اغراض و مقاصد ملحوظ نہ ہوں۔ اور ضروریات زندگی کے لحاظ سے توازن و تناسب موجود نہ ہو تو تسلیم کیا جائے کہ اس کا خالق ذی شعور اور صاحب اقتدار نہیں ہے لیکن اگر اس عالم کے اجزاء میں اغراض و مقاصد کے لحاظ سے تناسب پایا جاتا ہے تو پھر سب کو تسلیم کرنا چاہئیے کہ ضرور ان کا کوئی

خالق ہے جو شعور و اختیار کا مالک ہے۔

نظامِ ایجاد

اس دنیا کا جائزہ لیجئے تو آپ کو اس میں ترتیب و نظام نظر آئے گا طبیعیات سے متعلق جتنے علوم و فنون ہیں ان سب کی بنیاد کائنات کے قائم شدہ ترتیب و نظام پر ہے ورنہ اگر دنیا سے ترتیب و نظام ختم ہو جائے تو نہ علم النباتات کچھ رہے نہ علم الحیوانات، نہ علم معادن، نہ علم خواص الاشیاء، وغیرہ وغیرہ

سائنس کے تمام شعبے ختم ہو جائیں یہ جتنے علوم ہیں سب مبنی ہیں فطرت کے نظام، ارتباط اور ترتیب پر، بلکہ یہ علوم صرف نام ہیں اُس ترتیب کے سمجھنے کا جو مختلف قسم کے اشیاء میں پائی جاتی ہے۔ جتنا اس ترتیب کو زیادہ سمجھتے جاتے ہیں اتنا اپنے علم کو کامل تر خیال کرتے جاتے ہیں۔

واقعی بے انصافی ہے کہ ہم ایک ایسے گہرے نظام کو جس کے اسرار و رموز پر غور کرنے میں گزشتہ ہزاروں برس میں عقلاء مفکرین کی عقلیں صرف ہوئیں اور آج تک ہمارا دماغ اُس میں کسی آخری نقطہ تک نہیں پہنچا ہے۔ اور بہت سے اسرار میں جو اب تک سمجھ میں نہیں آئے ہیں۔ ایسی ترتیب

اور ایسے نظام کو ہم غیر ذی شعور، غیر ارادی، بے حس مادہ یا طبیعت کے حوالہ کر دیں۔

صناعی کی مثالیں

صنعت ہر زمانہ میں رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آج کل صناعی میں ترقی بہت ہو گئی ہے۔ مگر صنعتوں کا وجود پہلے بھی تھا۔

یہ دیکھئے دروازہ، اس کے پٹ اور چوکھٹ بازو۔ اس میں قبضے لگے ہیں۔ یہ دو لوہے کے ٹکڑے ایک دندانہ دار صورت پر بنائے گئے ہیں۔ بیچ میں ایک سلاخ لگا دی گئی ہے جو ان دونوں میں ارتباط پیدا کر دے قبضے اگر لوہے کے ٹکڑے سے ڈھلے ہوئے ہوتے تو جب دروازہ اور چوکھٹ بازو میں جڑ دئے جاتے تو دروازہ بھی جڑ جاتا۔ نہ کھل سکتا اور نہ بند ہو سکتا اور اگر دو لوہے کے ٹکڑے ہوتے الگ الگ جن میں کوئی جوڑ نہ ہو تو دروازہ دیوار سے الگ رہتا۔ مکان میں نہ لگ سکتا لیکن جب دو ٹکڑے ہوئے۔ اُن کے درمیان خاص طور سے ایک لوہے کی سلاخ کے ذریعہ سے وصل کیا گیا جس کی وجہ سے وہ دو ہونے کے ساتھ ایک ہو گئے۔ اب اُن کے ایک حصہ کو بازو کے ساتھ جڑ دیا جاتا ہے۔ دوسرے حصہ

کو دروازہ کے پٹ سے لگایا جاتا ہے۔ اس طرح دروازہ مکان میں لگ بھی جاتا ہے الگ نہیں رہتا اور پھر وہ درمیانی لوہے کی سلاخ محور بن کر اُسے کھلنے اور بند ہونے کا موقع دیتی ہے۔ جب چاہیں وہ کھل جاتا ہے اور جب چاہیں وہ بند ہو جاتا ہے۔ یقیناً غایت و مقصد کے لحاظ سے یہ ترتیب بتلاتی ہے کہ سمجھ دار صناع کی ایجاد ہے اور سابق زمانہ کے لوگوں کی ذہانت کا نتیجہ۔ مگر کیا انسان کے جسم میں یہی چوکھٹ بازو اور دروازہ کی صنعت زیادہ مکمل طور پر موجود نہیں ہے؟

یہ جوڑ بند اور مفاصل۔ یہ ہڈیاں ہیں ان کا جوڑنا مقصود ہے اگر بالکل الگ الگ رہیں اور ان میں ربط قائم نہ ہو تو یہ ہاتھ کہنی کے نیچے سے یونہی جھولتا رہے گا۔ قابو میں نہیں آسکے گا۔ اور اگر ان کو جوڑ دیا جائے بازو کی ہڈی میں تو یہ ہاتھ کھلے کا کھلا رہ جائے گا یا بند کا بند رہ جائے گا۔ جس طرح اگر شروع سے آخر تک یہ ہاتھ ایک مسلم استخوان سے بنا ہوا ہوتا تو اٹھنا بیٹھنا اور کام کرنا کسی صورت سے ممکن نہ ہوتا مگر ذرا دیکھئے تو کہ یہ کس ترتیب سے ملائے گئے ہیں۔ ان ہڈیوں کے آخری سرے ایسے دندانوں کی شکل میں ہیں جو آپ قبضوں کے دونوں پہلوؤں میں دیکھتے ہیں۔ اجتماع کے وقت دونوں طرف کے دندانے ایک خاص متحدہ صورت سے اس طرح ملتے ہیں کہ جدائی باقی نہیں رہتی۔ یعنی ہر طرف کے درمیانی شگاف میں دوسری طرف کا

بلند حصہ داخل ہو کر متحدہ شکل پیدا کر دیتا ہے۔ مگر ان دونوں کے ربط کے واسطے درمیانی سلاخ کا ہونا جیسا کہ قبضوں میں ہوتا ہے ہاتھ رکھنے، ٹیکنے، اور دیگر اعضاء و جوارح میں خاص خاص ضروریات زندگی میں جارج ہوتا اس لئے ان اعضاء میں ارتباط کے لئے باریک باریک رگیں بچھائی گئیں اور جلد کا غلاف چڑھایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنانے والے کو پہلے سے معلوم تھا کہ اس مخلوق کو کس طرح کی ضروریات پیش آئیں گی۔ پھر اگر غلاف جلد کاسا تنگ ہوتا تو ہاتھوں پیروں کے سمٹنے کی حالت میں جلد میں وہ کھنچاؤ پیدا ہوتا کہ کسی طرح بند کرنا اور سمیٹنا ممکن نہ ہوتا۔ مگر کیا کہنا اس صناع کا جو ان تمام حالات پر مطلع تھا۔ اُس نے جہاں جہاں جوڑ ہیں وہاں پر کثیر التعداد شکنیں یا چُنٹیں دے دی ہیں کہ جس وقت ہاتھ پاؤں کھولا جاتا یا پھیلایا جاتا ہے تو وہ چنٹیں کھنچ کر ایک تنی ہوئی شکل میں ہو جاتی ہیں۔ پھر کوئی شکن باقی نہیں رہتی۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شکنیں مقدار ضرورت کا اندازہ کر کے رکھی گئی ہیں نہ اُس سے زیادہ ہیں نہ اس سے کم۔

آپ آلۂ عکاسی فوٹوگرافی کی مشین کو ملاحظہ فرماتے ہیں، تعریف کرتے ہیں اور وہ ضرور قابل تعریف ہے۔ ایک بند اور محدود صندوق کے اندر ایک ایسا شیشہ ہے جو سامنے کی ہر چیز کا عکس لے لینے کے قابل ہے۔ وہ عکس لیتا ہے اور خاص صورتوں سے اسے محفوظ بھی کر لیتا ہے اور پھر دواؤں کے

ذریعہ سے اُسے صفحۂ کاغذ پر منتقل بھی کر دیتا ہے۔

ایجاد ہے اور بہت اچھی ایجاد آپ کہیں گے کہ اس کا موجد بڑے دماغ، اور ذہانت کا انسان تھا۔ میں آپ کے ساتھ اس امر پر متفق ہوں۔ مگر جب آپ اتنی صنعت کو ایک عقل اور شعور والے صناع کی طرف نسبت دیتے ہیں تو اگر آپ کے جسم میں یہ اس سے زیادہ مکمل صورت پر موجود ہو تو اُسے طبیعت کی کرشمہ سازی اور اجزاء مادہ کی غیر ارادی حرکت کا نتیجہ کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟

موجودہ آلات عکاسی میں کتنی کمزوریاں ہیں۔ جس رخ پر آپ نے اُن کے شیشہ کو لگا دیا ہے، جب تک آپ ہی نہیں دوسرے رخ پر نہ لگائیں وہ اُدھر مڑ نہیں سکتے۔ ایک شیشہ پر جب ایک تصویر آ گئی تو جب تک وہ تصویر محو نہ ہو یا اُسے دھویا نہ جائے اور شیشہ بالکل صاف نہ کیا جائے۔ دوسری تصویر پھر اُس شیشہ پر نہیں آ سکتی۔

شیشہ تصویر کو اپنے قد و قامت کے مطابق لے گا۔ اگر چھوٹا شیشہ ہے تو چھوٹی تصویر آئے گی چاہے وہ چیز بڑی ہو۔ اور بڑا شیشہ ہو تو بڑی تصویر لے گا۔ چاہے وہ چیز چھوٹی ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی واقعی مقدار ظاہر نہ ہو گی۔ لیکن یہ آلۂ عکاسی جو آپ کے جسم میں ہے اسے بنانے والے نے ایک بلند جگہ پر رکھا ہے تاکہ دور دور کی چیزوں کا آسانی

سے تقابل ہو سکے۔ اس میں دروازے لگائے ہیں جن کے بند ہوتے اور کھل جاتے ہیں تاکہ گرد و غبار سے شیشے خراب نہ ہوں اور ان میں چلمنیں لگائی ہیں جو دروازوں کے کھلے ہونے کی حالت میں اٹھتی اور گر پڑتی ہیں۔ اس میں ایک ایسی کل لگائی گئی ہے جس سے وہ شیشے چاروں طرف گھوم کر ہر طرف کے عکس لیتے رہتے ہیں یہ شیشے ایک عکس کو لے کر بیکار نہیں ہو جاتے نہ اُن کے بدلنے کی ضرورت پڑتی ہے نہ دھونے صاف کرنے کی حاجت ہوتی ہے بلکہ خود ان میں یہ خاصیت ہے کہ صورت لیں بھی اور پھر سادہ بھی رہیں اور وہ صورت محو بھی نہ ہو بلکہ فوراً ایک خزانہ میں منتقل ہو جائے۔ جہاں وہ محفوظ رہے اور جب انسان چاہے وہ تصویر اس البم سے نکل کر پھر اس کے پیشِ نظر ہو جائے وہ شیشے ہر وقت تصویریں لیتے اور پھر ہر وقت سادہ اور دوسری تصویر لینے کے لئے آمادہ ہیں۔ اُن کی تصویر اگر شرائط مقابلہ کے اعتدال کے ساتھ ہے تو اتنی ہی بڑی ہوتی ہے جتنی اصل اُس شئے کی مقدار ہے چاہے وہ بڑی سے بڑی چیز کی صورت ہو اور چاہے چھوٹی سے چھوٹی چیز کی۔ بہرحال اُس کی اصلی مقدار محفوظ رہتی ہے۔

یہ آلہ عکاسی کوئی اور نہیں۔ نظر اٹھایئے دیکھیے تو آپ کی دونوں آنکھیں ہی ہیں۔ انہیں کاسہ سر میں جگہ دی گئی ہے جو عمارت جسم کا بلند طبقہ

ہے تاکہ دور کی چیزوں کا بآسانی مقابلہ ہو سکے اُن کے لئے پپوٹوں کے دروازے قرار دئے گئے ہیں جو بوقت ضرورت کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ اُن کے لئے پلکوں کی چلمنیں بنائی گئی ہیں جو اُٹھتی اور گر پڑتی ہیں۔ اُن کو گردش کی طاقت دی گئی ہے کہ یہ چاروں طرف کے نقشوں کو لے سکیں اور پیش نگاہ کر سکیں۔ ان دونوں آنکھوں میں عجب اتحادِ عمل قرار دیا گیا ہے کہ ہیں دو مگر صورت جس کا احساس ہوتا ہے ایک ہے اور وہ دونوں اس صورت کو لے کر حس مشترک اور پھر حافظہ کے خزانہ میں منتقل کر دیتی ہیں اور خود دوسری صورتوں کے ادراک کے لئے سادہ رہتی ہیں اور اپنی مختصر ہستی کے باوجود بڑے سے بڑے پہاڑ، دریا، سمندر کی تصویر لیتی اور اسے اتنا اتنی ہی دکھلاتی ہیں جتنا وہ ہے۔ اُن کے محسوسات کا چھوٹا بڑا ہو جانا شرائط روایت کے عدم اعتدال کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ فقط اپنی عکس گرفتہ صورت کی ظاہری شکل اور ہندسی مقدار ہی کو نہیں دکھلاتیں بلکہ اُس کے رنگ روپ، حرکت اور سکون کو بھی اصلی طور پر پیش کرتی ہیں جس میں اختلاف نہیں ہوتا۔ یہ ہے ایک انسان کی دیکھتی ہوئی آنکھ۔ یہ ہے وہ آلۂ عکاسی جس کی مثال دنیا کی طاقتیں پیش نہیں کر سکتیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اتنا نازک شیشہ نہیں ہو سکتا۔ جتنا آنکھ کا پردہ نازک ہے۔ مگر قدرت نے اُس کی حفاظت کے لئے عجب سامان رکھا ہے۔ حالانکہ ایک بھرے بازار میں

جہاں ہجوم زیادہ ہو ایک شیشہ کا گلاس ہتھیلی پر رکھ کر تو جائیے۔ دیکھئے گا کہ اس کا بچنا ایک بالکل معمولی چیز ہے۔ مگر حوادث عالم میں انسان نہ معلوم کتنی مرتبہ گذرتا ہے۔ کتنی چوٹیں لگتی ہیں اور کتنی سخت چیزوں کا مقابلہ ہوتا ہے لیکن شاذ و نادر وہ صورتیں ہوتی ہیں کہ آنکھ پر ضرب آ جائے۔ یہ صرف قدرت کی طرف کا سامان ہے۔ خطرناک چیز آنکھ کے سامنے آئے گی تو غیر ارادی طور پر پپوٹے بند ہو جائیں گے۔

اسی طرح انسان کے اعضاء و جوارح میں سینکڑوں صنعتیں مضمر ہیں جو علم تشریح میں ظاہر ہوئی ہیں۔ اور اب تک تحقیقات سے منکشف ہوتی جاتی ہیں۔ یہ بالکل کھلی ہوئی دلیل ہے اس کی کہ یہ نظام کسی صاحب دانش ہستی کا قائم کیا ہوا ہے۔

اگر یہ دنیا کسی ذی شعور و صاحب اختیار شخص کی کارکردگی کا نتیجہ نہیں ہے تو اس میں اغراض و مقاصد کی تلاش ہی غلط ہوگی۔

مگر وہ جو دنیا کو نشو و ارتقائے طبعی کا نتیجہ مانتے ہیں وہ خود ارتقاء کے ثبوت میں اس طرح استدلال پیش کرتے ہیں کہ ہم بعض حیوانات، کے اعضا میں بعض چیزیں ایسی پاتے ہیں جن سے اس نوع کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ جیسے انسان اور بعض جانوروں میں ذکور کے سینہ پر نشانات، حالانکہ اس کا فائدہ صنف اناث سے مخصوص ہے اور ذکور کے لئے اُن کا کوئی فائدہ نہیں

ہے۔ اسی طرح آنتوں میں بعض حصے اور اسی طرح کے بعض دوسرے اجزاء جن کا کوئی فائدہ اس نوع کی زندگی میں نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعضاء کسی گذشتہ نوع کے پس ماندہ آثار ہیں جو ان اعضاء سے مستفید ہوتی تھی اور اُس کے نظام زندگی میں ان اعضاء کو مدخلیت حاصل تھی اب ترقی کر کے نوع بدل گئی اس لئے اُن اعضاء کی ضرورت جاتی رہی مگر آثار اُن کے باقی ہیں۔

یہ استدلال صاف بتلاتا ہے کہ کہنے والا اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ جسم حیوانی کے ہر جزو کا کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور ہے، اس لئے اگر ڈھونڈھنے پر کوئی فائدہ نہیں ملتا تو وہ یہ رائے قائم کرتا ہے کہ ضرور اس کے پہلے کوئی مخلوق ہوگی جو اس جزو سے فائدہ اٹھاتی ہوگی اس کے معنی یہ ہوئے کہ تسلیم شدہ چیز ہے کہ عالم کائنات میں ہر چیز کسی مصلحت اور مقصد سے ہے۔ مگر یہ بالکل عجیب بات ہے کہ ایک سائنس میں دنیا کی ہر چیز کو فائدہ و مقصد کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے اور دوسری سائنس میں ان تمام چیزوں کو بے حس و بے شعور طاقتوں کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے اور ان کے لئے کسی با اختیار فاعل کی کارکردگی کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔

یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ انسانی جسم میں اعضاء و جوارح، عروق و شرائین، اعصاب و عضلات سب کو شمار کیا جائے تو یہ ایک دنیا ہے جو موجود ہے۔ ان میں ڈھونڈھنے کے بعد صرف دو چار چیزیں ایسی بتلائی جاتی ہیں کہ جن کا کوئی فائدہ اس نوع میں ظاہر نہیں ہوتا۔ مثلاً آنتوں میں ایک بڑھا ہوا ٹکڑا جس

کو عربی میں "معارا عور" کہتے ہیں۔ یا کان کے بعض حصے یا سینہ پر کے نشانات۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ فیصدی ۹۸ چیزوں کے انسانی اجزا میں فوائد دریافت ہو گئے ہیں اور صرف یہ دو ایک چیزیں رہ گئی ہیں جن پر زور دیا جاتا ہے کہ ان کا کچھ فائدہ نہیں ہے۔"

اب یہ انصاف طلب سوال ہے کہ فیصدی ۹۸ چیزیں جن کے مقاصد و فوائد سمجھ میں آ گئے معیار بننے کے قابل ہیں اور ان سے یہ نتیجہ نکالا جائے گا کہ ان کا موجد عقل و شعور کا مالک ہے یا فی صدی دو چیزوں کو معیار بنا کر اُس کے عقل و شعور کی نفی کی جائے۔ پھر یہ فیصدی ۹۸ باتیں بھی جن کے اصل رموز عام طور پر سمجھ میں آ گئے ہیں یہ بھی تو ایک ہی دفعہ معلوم نہیں ہو گئے بلکہ بہت سی باتیں تھیں جو سو برس پہلے نہیں معلوم تھیں۔ اُس کے بعد معلوم ہوئیں اور یوں ہی تدریجی حیثیت سے ان تمام باتوں کا علم حاصل ہوا ہے۔ پھر جو چیزیں باقی رہ گئی ہیں اُن کے متعلق کیونکر سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کے اسرار و رموز کا علم مستقبل میں حاصل نہ ہو گا۔ پھر یہ قطعی حکم کیونکر لگایا جا سکتا ہے کہ اس جزو کا اس نوع میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔

کائنات عالم کی مصلحتیں عقلائے زمانہ کے لئے برابر منکشف ہوتی جاتی ہیں اور جتنی دنیا ترقی کرے گی اور آگے بڑھے گی۔ اُتنے دلائل وجودِ خدا زیادہ پیدا ہوتے جائیں گے اور عقل انسانی خدا کی معرفت

سے قریب تر ہوتی جائے گی۔